www.naushahidynasty.com

باب 3

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی پنجابی شاعری

(فنی مطالعہ)

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے کلام میں صوفیانہ مسائل

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی شاعری میں صوفیانہ مسائل کا جائزہ لینے سے قبل تصوّف، اسلامی تصوّف اور دیسی تصوّف پر نظر ڈالنا زیادہ مناسب ہوگا تا کہ واضح ہو سکے کہ نوشہ صاحبؒ نے اپنی شاعری میں تصوّف کے کن کن مسائل کو بیان کیا ہے، کس مسئلے کا زیادہ اثر قبول کیا ہے اور ان مسائل کے کن کن پہلوؤں میں اضافہ کیا ہے۔

تصوّف ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق ہر مکتبہ فکر کے صوفیائے کرام نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ یہ اس فکر کی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان تکون کے اُن تینوں زاویوں کو سامنے رکھ کر غور و تدبر کرتا ہے جو انسان، کائنات اور خدا، تینوں زاویوں سے وجود پاتی ہے۔ جب انسان اس تکون کے تینوں کونوں کو اپنی صحیح سوچ کے صحیح زاویے سے ملانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ حقیقت کو پا لیتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے مسلمان صوفیاء نے اس پر بھرپور توجہ دی ہے۔

صوفیائے عظام نے اس تکون کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر لوگوں کے دل جیتنے کے ساتھ ساتھ ان کی روحانی تربیت کا بھی اہتمام کیا ہے۔ ان بزرگانِ دین نے ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد خود عبادت اور ریاضت کے ذریعہ سلوک کی منزلیں طے

کیں اور حقیقت شناسی کے بعد لوگوں کی راہنمائی اور ہدایت کے فرائض اپنے ذمہ لیے۔ تصوّف کی کٹھن منزلیں طے کرنے کے دوران میں ان کو جن دشواریوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور جو تجربے حاصل ہوئے، ان کو صوفی شعرا نے اپنے کلام اور تحریروں کے ذریعے لوگوں تک بدرجہ اتم پہنچایا۔

تصوّف کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیئے؟ اس پر گفتگو کرنے سے قبل ہمیں تصوّف سے متعلق صوفیائے عظام کی ان مختلف آراء کو دیکھنا ہوگا جو انہوں نے اپنے اپنے زمانے میں پیش کیں۔ اس نازک موضوع پر ہر صوفی نے اپنے نقطہ نظر سے لکھا ہے۔ یہی وجہ کہ ''تصوف'' کی کوئی ایک جامع تعریف سامنے نہیں آتی۔ مثلاً امام قشیریؒ باطن کی صفائی، تعمیر اور اصلاح کے ساتھ ساتھ اخلاق کی طہارت کو تصوّف کا نام دیتے ہیں۔[1] حضرت شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کے نزدیک تصوّف ایک ایسا علم ہے جو نفس کی صفائی، اخلاق کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ انسان کے ظاہر اور باطن کی اس طرح تشکیل کرتا ہے کہ اسے ہمیشہ کی نیکی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ سعادت مند بن جاتا ہے۔ مولانا رومؒ، نفس کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر چھوڑ دینے یعنی راضی بہ رضا رہنے کو تصوّف سمجھتے ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدینؒ سہروردی، شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے خیالات سے صاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں، تصوّف ان لوگوں کیلئے ہے جو اپنی عقل کو سنتِ رسول ﷺ پر صرف کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی خباثتوں سے دامن بچا کر دلوں کو حق کی جانب راغب کرتے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے پاکیزہ دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صوفی کہا جاتا ہے۔[2] حضرت ابو الحسن نوریؒ غیر نفسانی خواہشات کو ترک کرنے کو تصوّف کا نام دیتے ہیں''[3] علامہ ابن القیم مدارج السالکین میں تصوّف کے

1- رسالہ قشیریہ ص 7۔ امام قشیری (376 ۔ 465ھ) یہ رسالہ کشف المحجوب سے کچھ عرصہ پہلے تحریر ہوا۔

2- عوارف المعارف، دار الکتاب العربی بیروت 1966ء ص 27

3- کشف المحجوب اردو ترجمہ ایف ڈی گوہر، لاہور 1972ء ص 40

معنی خُلق جنین بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس علم کی عمارت ارادے پر تعمیر کی جاتی ہے، یہی اسکی بنیاد ہے۔ اس علم کا دل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کی تمام تر سرگرمیاں دل کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ جس طرح علم فقہ کے سارے احکامات دراصل اعضاء اور جواہر کی تفصیل پر مشتمل ہوتے ہیں، جس کی بنیاد پر اسے عِلم ظاہری کہا جاتا ہے، اسی طرح تصوّف کا چونکہ دل کی کیفیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لیے اسکو عِلم باطن کہتے ہیں۔

شیخ ابو الحسن بن محمد شیرازیؒ کے خیال میں تصوّف ایک وعدہ ہے، جسے پورا کرنے کے بعد صوفی واصل بالحق ہو جاتا ہے۔[1] امام الاولیاء حضرت علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخشؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ تصوّف آٹھ چیزوں کا نام ہے۔

1- سخاوت ابراہیمؑ، 2- رضائے اسحٰقؑ، 3- سیاحت عیسیٰؑ، 4- صبر ایوبؑ، 5- مناجات زکریاؑ، 6- غربت یحییٰؑ، 7- خرقہ پوشی موسیٰؑ، 8- فقر سرور کونین ﷺ[2]

حضرت ابن الجلاؒء فرماتے ہیں کہ تصوّف ایک ایسی حقیقت ہے جسکی رسمی تعریف نہیں ہوسکتی۔ یہ خاصہ الٰہی سے اس میں دنیا کے رسم و رواج سے جدا ہونا پڑتا ہے۔[3] حضرت ذالنون مصریؒ کے نزدیک اپنے دل کو حق بات کی مخالفت سے بچانا اور دل کی نورانیت کو کدورت سے محفوظ رکھنے کا نام تصوف ہے۔[4] حضرت محمدؒ بن علیؒ بن الحسینؓ ابن علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ تصوف ایک نیک خصلت ہے جو جس قدر زیادہ نیک خصلت ہے اُسی قدر اعلیٰ صوفی ہے۔ حضرت مرتعشؒ نے تصوف کی یہی تعریف بتائی ہے۔[5] حضرت ابوعلی قزوینیؒ نے تصوّف کو پسندیدہ خصلت قرار دیا

1- سفینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) کراچی 1961ء ص 196
2- کشف المحجوب اردو ترجمہ ص 41
3- ایضاً
4- ایضاً
5- ایضاً ص 42

ہے۔ پسندیدہ خصلت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ پسندیدہ خصائل سے مراد وہ خصلتیں ہیں جن کی بنا پر بندہ ہر حال میں اپنے رب کی رضا پر خوش رہتا ہے۔[1] حضرت ابوالحسن نوریؒ تصوّف کو ایک ایسی آزادی قرار دیتے ہیں جس کے تحت بندہ حرص کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تصوّف اس جوانمردی کا نام ہے، جس کے سہارے انسان نفسانی خواہشات پر قابو پالیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تصوّف ایک ایسی سخاوت ہے کہ بندہ دنیا کو دنیا داروں کے لئے چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔[2] امام غزالیؒ کے نزدیک تصوّف کا علم نفسانی خواہشات کو ختم کرتا ہے۔ برے اخلاق اور بُری عادتوں کو مٹاتا ہے۔[3] حضرت ابومحمد الحریریؒ کا ارشاد ہے کہ تصوّف انسان کے باطن کو نیک عادات سے مزین کرتا ہے اور باطن کی شیطانی خصلتوں کو باہر نکالتا ہے۔[4] حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں کہ تصوّف دراصل حقیقت کو پا لینے اور دنیا سے کنارہ کش ہونے کا نام ہے۔[5] امام شرف الدین شوکانی کے خیال میں تارک الدنیا ہو جانا، مٹی اور سونا، نقائص اور صفات کو برابر سمجھنا ہی تصوّف ہے۔[6] کشف المحجوب میں حضرت جنید بغدادیؒ کا قول درج ہے کہ انسان کا حقیقت پر پختہ ایقان ہی تصوّف ہے۔ بلاشبہ یہ صفت ربانی ہے لیکن بظاہر یہ انسان کی صفت ہے کہ حضرت ابوعمر دمشقیؒ کے نزدیک تصوّف دنیا کو عیب جوئی کی نگاہوں سے دیکھنے بلکہ دنیا کی طرف بالکل ہی نہ دیکھنے کا نام ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن حکیم کی سورۃ مزمّل میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[7] حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بقول تصوّف راہ صدق اور

1- کشف المحجوب اردو ترجمہ ص 43
2- ایضاً
3- غزان سید: کلاسیکی ادب، عزیز بکڈپو لاہور 1975ء ص 240
4- ماہنامہ لہراں، لاہور شمارہ مارچ اپریل 1976ء
5- رسالہ قشیریہ ص 127
6- ماہنامہ لہراں، لاہور شمارہ مارچ اپریل 1974ء
7- خلیق نظامی: تاریخ مشائخ چشت، ندوۃ المصنفین دہلی 1953ء ص 29، 58، 57

اخلاق حسنہ کا نام ہے۔[1] کچھ ایسی ہی بات حضرت شیخ محمد بن قصابؒ نے کی ہے کہ تصوّف اخلاق کریمہ ہے۔[2]

تصوّف کے متعلق اگر بزرگان دین کی ان تعریفوں کو سامنے رکھیں تو یہ بات بڑی آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ ہر بزرگ نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے تصوّف کو سمجھا ہے۔ مگر ان تمام تعریفوں میں بہت سی باتیں مشترک بھی نظر آتی ہیں۔ بلکہ حقیقت ہے کہ تصوّف کے متعلق مختلف تعریفیں پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ تصوّف ایک ایسا تناور درخت ہے جسکی بہت سی شاخیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان تمام افکار و نظریات کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ بہر حال ان تمام تعریفوں کو سامنے رکھتے ہوئے تصوّف کی جامع تعریف یوں کی جاسکتی ہے:

> تصوّف وہ علم ہے جس سے انسان کے نفس کی بہت اچھی طہارت ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں اخلاقی پاکیزگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کے باطن کی تعمیر و اصلاح ہو جاتی ہے۔ تصوّف، انسان کو برے اخلاق، خبیث صفات، نفسانی خواہشات اور برے خیالات سے نجات دلاتا ہے۔ یہ اچھے اخلاق اور پاکیزہ اوصاف پیدا کرنے کا وسیلہ ہے۔ اسی علم کے ذریعے انسان حقیقت کو پا لیتا ہے اور دنیا کی ہوس سے منہ موڑ کر ہر طرف حق ہی حق دیکھتا ہے۔

تصوّف، سخاوت، درویشی، فقر، صبر، ریاضت، عبادت، غربت، سیاحت اور رضائے الٰہی تلاش کرنے کا نام ہے۔ باالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اپنی ذات کی نفی کرنے کا نام تصوّف ہے۔ مگر یہاں ایک بات بے حد اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے ''خدمتِ خلقِ خدا'' ایک انسان خلقِ خدا کی خدمت تب ہی کر سکتا ہے، جب وہ اپنی ذات کی نفی کر

1- خلیق نظامی: تاریخ مشائخ چشت، ندوۃ المصنفین دہلی 1953ء ص 29، 58، 57

2- ایضاً

دے اور دوسرے لوگوں کو ہر حالت میں اپنے سے بہتر اور افضل سمجھے۔ کیونکہ یہی بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ انسان اللہ کی مخلوق کے ساتھ نیکی کرے اور بہتر طریقے سے پیش آئے۔ انسان ان عادات و خصائل کے باعث اللہ کو مقبول ہو جاتا ہے۔ جو شخص اللہ کو مقبول ہو جائے اسکے لیے حقیقت کے تمام دروازے وا ہو جاتے ہیں اس وقت وہ منزل کی طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو منزل خود بخود اسکی طرف کھنچتی چلی آتی ہے۔ اسی لئے تصوّف نفسانی خواہشات سے بچنے ، عاجزی، انکساری، خُلقِ جمیل، نرمی، جستجو اور راضی بہ رضا رہنے کا نام ہے۔ اس علم کی بدولت انسان دنیا کی بے ثباتی کو دیکھتے ہوئے ہر لمحہ رب کے ذکر اور فکر میں گزارتا ہے اور آخر کار حقیقتِ ازلی و ابدی کو تلاش کر لیتا ہے۔

تصوّف کے مسلک پر چلنے والے کو صوفی کہتے ہیں۔ ایک صوفی کو حق تعالیٰ کے حسن کے جلوے دیکھنے اور واصل باالحق ہونے کے لیے سلوک کی مندرجہ ذیل منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔

1- توحید، 2- علم، 3- استغنیٰ، 4- منزل فقر، 5- منزل حیرت

مناسب ہوگا کہ یہاں لفظ صوفی کی تعریف بیان کر دی جائے تا کہ تصوّف اور مسائل تصوّف کی تفہیم میں آسانی رہے۔

صوفی کسے کہتے ہیں

بعض محققین کا خیال ہے کہ تصوّف کا مادہ ''ص، و، ف'' صوف ہے جس کے معنی اون یا پشم ہے۔ چنانچہ صوفی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اون یا پسم کا لباس پہنتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کے نزدیک صوفی کا لفظ ''صفا'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اصحاب صُفّہ سے نسبت کی بنا پر لفظ صوفی بنا۔ مگر یہ لغوی اعتبار سے غلط لگتا ہے۔ کیونکہ صفہ سے صفوی بنتا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ یہ لفظ صف

سے وجود میں آیا ہو۔ اسکی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ صوفی قرب الٰہی میں سب سے پہلی صف میں ہوتا ہے۔ بعض لوگ صوفی کو قدیم عربی قبیلہ صوفہ سے بعض یونانی لفظ شیو صوفیا کو اس کا مآخذ قرار دیتے ہیں۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ صوف اور صفا ہی صوفی کا مآخذ ہو سکتے ہیں۔[1] ابن خلدون نے بھی صوفی کا مادہ صوف ہی ظاہر کیا ہے:

''میری رائے میں صوفی صوف ہی سے مشتق ہے۔ کیونکہ یہ فرقہ عام لوگوں کے برخلاف اعلیٰ درجے کے کپڑے پہننے کی جگہ موٹے چھوٹے اونی کپڑے پہنتا رہا ہے۔''[2] لیکن ڈاکٹر سید اختر جعفری کا خیال ہے کہ صرف ''صوف'' کا لباس پہننے سے نہ کوئی صوفی بن سکتا ہے اور نہ ہی تصوّف کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ مگر یہ مسلمہ امر ہے کہ صوف کا کھردرا لباس پہننا تصوّف کی پہلی سیڑھی ہے۔ جس کا سب سے بڑا مقصد جسم کو سختیاں برداشت کرنے کے قابل بنانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی موٹا کھردرا لباس پہن کر اپنے آپ کو ذکر اور فکر میں مشغول رکھتے تھے۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ موٹا کھردرا لباس قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ صوفی اس سے عبادت، ریاضت اور باطن کی صفائی کی جانب راغب ہوتا تھا۔ ان ہی دلائل کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کے نزدیک لفظ صوفی کا مادہ صوف کی بجائے ''صفا'' زیادہ مناسب ہے۔[3] کیونکہ تصوف کا تعلق دل کی صفائی کیساتھ ہے۔ صوفی زیادہ توجہ باطن کی صفائی پر دیتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف برطانیہ میں لفظ ''صوفی'' کو بہت قدیم زمانے سے مانوس بتایا گیا ہے:

1- اردو دائرہ معارف اسلامیہ؛ پنجاب یونیورسٹی لاہور، 1964ء جلد 6 ص 418

2- مقدمہ ابن خلدون، اردو ترجمہ، مولوی عبدالرحمٰن لاہور، س ن جلد 3 ص 104

3- اختر جعفری ڈاکٹر: میاں محمد بخش حیاتی تے شاعری، مقالہ پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص 549

"Sophist, the nane given by Greeks about the middle of the 5th centeries B.C, to certain teacher of a superior grade, who distingueshing themselves from philosophers on one hand and from artist and craptsmen on the other clamed to repair their pupil not for any particular study or profession but for cvic life."[1]

لفظ صوفی کی تعریف کے بارے میں داتا گنج بخشؒ کا فرمان ہے:

"پس چوں اہل ایں قصہ اخلاق و معاملات خود را مہذّب کردہ اندو از آفاتِ طبیعت تبری جستہ پس مرایشان راصوفی خوانند"[2]

اسی طرح حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ[3] نے صوفی کی تعریف بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ صوفی ہر قسم کی میل کچیل سے پاک ،غوروفکر میں ڈوبا ہوا، دنیا سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی طرف دھیان رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک سونا اور مٹی برابر ہوتے ہیں۔ شیخ ابو النصر سراج[4] کا قول ہے کہ صوفی کی اولین صفت یہ ہے کہ وہ صرف اللہ پر ہی نظر رکھے۔ غیر اللہ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ اس کا مطلوب اور مقصود صرف ذاتِ خداوندی ہو۔

بقول حضرت ابوعلی باریؒ صوفی وہ ہے جو ماسوااللہ، اپنے من کو ہر شے سے پاک کرلے۔ حرص اور ہوس کو مٹا کر صوف کا لباس پہن لے اور حضورﷺ کے نقش قدم پر چلے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے ہر شے پر اللہ تعالیٰ کو ترجیح دی،

1- Encyclopaedia of Britannica vol - 20 P.1001

2- کشف المحجوب ص 23

3- ابو بکر بن ابو اسحٰق الکلا بازی: التعر ف؛ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور 1978ء ص 43

4- ابوالنصر سراج: کتاب اللمع فی التصوف، لیڈن 1914ء ص 111

وہی صوفی ہے۔حضرت جنید بغدادیؒ کے الفاظ میں صوفی اپنی ذات میں ایک زندہ لاش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے جاودانی زندگی بخش دیتے ہیں۔لہٰذا صوفی میں ان آٹھ صفات کا ہونا ناگزیر ہے۔

" التصوّف مبنی علیٰ ثمان خصال، اماالسخافلا براھم و امالرضأ فلا سماعیل و اما الصبر فلایوب و اما الاشارة قلذکریا و املا الغربه فلیحییٰ و اما بس الصوف فلموسیٰ و امالساحة فلعیسیٰ و امالفقر فلمحمد ﷺ علیهم اجمین"[1]

ایک صوفی کے یہی خصائل حضرت غوث الاعظمؒ نے بیان فرمائے ہیں۔[2] ان تمام تعریفوں کے پیش نظر ہم مختصر الفاظ میں تصوّف کی منزل کے راہی یعنی "صوفی" کی تعریف یوں کر سکتے ہیں۔صوفی وہ شخص ہے جو اللہ کی خاطر حرص و ہوس اور لالچ و آز سے جنگ لڑ چکا ہو۔سنت رسول ﷺ کا پیروکار ہو اور دنیاوی شان و شوکت سے نفرت کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ جوڑ چکا ہو۔حقیقت کے رازوں کا شناسا ہو۔بخشش کرنے والا، دل کا سخی ہو۔

تصوّف کے سرچشمے

تاریخ کے اوراق اُلٹنے سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ تصوّف، دینِ اسلام کی پیداوار ہے۔ڈاکٹر براؤن نے فارسی ادب کی تاریخ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ تصوّف کی تعلیم حضرت محمد ﷺ کی باطنی تعلیم سے نمودار ہوئی۔[3] پروفیسر موہن سنگھ

1- کشف المحجوب ص 29

2- عبدالقادر جیلانیؒ، فتوح الغیب: مصر 1973ء ص 166

3- ماہنامہ پنجابی ادب لاہور (شاہ حسین نمبر) ص 15

کہتے ہیں کہ صوفی مت (تصوّف) کا جنم اسلام کیساتھ ہوا۔ اسکی پہلی کونپل قرآن شریف، حضرت محمد ﷺ کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے پھوٹی ہے۔

مولانا جامیؒ نے ابو الہاشم کو پہلا صوفی کہا ہے۔[1] جوکوفہ کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں شام میں رہائش اختیار کر لی تھی اور بصرہ میں وہ 161 ہجری میں ثفیان ثوری کے ہم مجلس رہ چکے تھے۔[2] جبکہ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے حدیث میں سے صوفی مت (تصوّف) کی بشٹی کا مسالہ تلاش کرنے والا صوفی اسد المحاسبی حارث 223 ہجری/ 837ء میں ہوا۔[3] موہن سنگھ جوہل نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ہندوستان میں تصوّف مسلمانوں کی آمد کیساتھ ہی آیا اور حقیقت میں یہ اسلام کی پیداوار ہے۔

ڈاکٹر لاجونتی رام کرشنا نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ تصوّف بنیادی طور پر اسلام کے بیج سے پھوٹا تھا اور تمام صوفیائے کرام پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کو اپنا آئیڈیل مانتے تھے۔ قرآن حکم کی تمثیلی آیات کو اپنے افکار کی جڑ بتاتے تھے۔[4] یوں ہی پروفیسر لوئی مسین نیون نے بھی بڑی محنت اور کاوش سے یہ ثابت کیا ہے کہ تصوّف کا منبع اور مخرج قرآن، حدیث ہے اور یہ ایک خالصتاً اسلامی تحریک ہے۔[5]

1- مولانا عبدالرحمٰن جامی: نفحات الانس اسلامیہ پریس لاہور 1927ء ص 21

2- عباد اللہ اختر: علم تصوف، لاہور 1951ء ص 8

3- پنجابی ادب (شاہ حسین نمبر) ص 20

4- لاجونتی رام کرشنا: پنجابی دے صوفی شاعر مجلس شاہ حسین لاہور ص 6 , 2

5- تاریخ مشائخ حیثیت ص 34

اخلاقی پہلو

بعض لوگ کہتے ہیں۔تصوّف اسلامی لفظ نہیں ہے۔ نہ ہی قرآن و حدیث میں تصوّف اور صوفی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں عہد رسالتؐ میں کسی بھی شخص کو صوفی نہیں کہا جاتا تھا۔ یہ اصطلاح بہت بعد میں ایجاد ہوئی۔ بلکہ بغداد کے لوگوں نے اس اصطلاح کو ایجاد اور استعمال کیا۔

جہاں تک لفظ ''تصوّف'' اور لفظ ''صوفی'' کا تعلق ہے۔تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ بہت قدیم ہیں۔تصوّف خالصتاً عربی لفظ ہے جو حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں مروج تھا۔ بلکہ کتاب'' اخبار مکہ'' میں محمد اسحٰق بن یساء کی روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تصوّف کا لفظ عہد رسالتؐ سے پہلے بھی عربی زبان میں رائج تھا جو نیک و پارسا لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ایک حدیث شریف میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔سرکار دو عالمﷺ نے فرمایا:

''مَن سَمِعَ صَوتَ اَهْلِ التَّصوُّفِ فَلاَ یُؤمِنُ علٰی دُعَائِهِم کُتِبَ عِند اللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِیْن''(1)

یعنی جس نے اہل تصوّف کی آواز سن کر ان کی دعوت قبول نہ کی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ غافلوں میں لکھا گیا۔

اس حدیث سے نہایت واضح ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے اور آنحضرت محمدﷺ کے زمانے میں نیک لوگوں کے لیے مستعمل تھا۔اسی لفظ کی نسبت سے صوفی کا لفظ وجود میں آیا۔لیکن عہد رسالت کی کتب میں اس لفظ کا زیادہ استعمال نہیں ملتا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ عہد رسالت میں لفظ صحابی عام مستعمل تھا اور یہ لفظ صوفی سے زیادہ وسیع اور وقیع ہے اور واضح مفہوم پیش کرتا ہے۔ اسی بنا پر صوفی کی بجائے صحابی کا لفظ

1- کشف المحجوب ص30

عام استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل دی جا سکتی ہے کہ محی الدین ابن عربی (م 638ھ/ 1240ء) اور شرف الدین عمر الفارس (م 632ھ/ 1234ء) دونوں عربی نژاد تھے۔ دونوں نے اپنے افکار اور نظریات سے ایران کے صوفیاء کو متاثر کیا تھا:

> "Such as Shaykh Mohyiyud-Din lbnul Arbi (AD1240-1) and lbnnl Faris (AD 1234-5) were men of Arabic speach in whose veins there was not a drop of Percianblood. Yet the first of these exerted an enarmous influance over many of the most typical Percian sufis such as Iraqi (AD 1287) (1)

عراقی (م 686ھ/ 1287ء) احد الدین اکبر فانی (م 697ھ/ 1297ء) عبدالرحمٰن جامی (م 898ھ/ 1492ء) یہ تمام صوفیائے کرام عربی تصوّف سے متاثر تھے۔ ابن عربی کی تصنیف فصوص الحکم کے اثرات تو آج تک فارسی، اردو اور پنجابی شعراء وصوفیا پر موجود ہیں کیونکہ یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک ایران کے مدارس اور خانقاہوں میں درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی اور اسکی بہت سی شرحیں اور تفاسیر بھی لکھی گئیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تصوّف کی بنیاد ہندوؤں کا فلسفہ ویدانت ہے۔ یہ غلط فہمی دراصل ابو ریحان محمد بن البیرونی (962۔ 1048ء) کی پیدا کردہ ہے۔ جس نے ہندومت کی بعض باتوں کا اسلامی تصوّف سے موازنہ کرتے ہوئے چند مسائل مشترک ظاہر کیے ہیں۔ مثلاً مسئلہ تناسخ ''یعنی روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہونا ہے۔ اسی مسئلہ کے پیش نظر پروفیسر ماسنگون اور پروفیسر براؤن نے کہا کہ

1- E.G. Brown: A Literary History of Percia Londan 1908 P.420

ظاہرا طور پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام کے مسلک اور ہندو ویدانت سارا میں بے حد یکسانیت ہے اسی خیال کو بنیاد بنا کر براؤن نے تصوّف کے تین مآخذات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

1- ویدانتا ..... 2- فارسی فلسفہ ..... 3- نوفلاطونی فلسفہ

(a) That sufism owes its inspiration to lndian Philosophy and especially to the Vedonta.

(b) That the most characteristic ldeas in safism are the Persian origin.

(c) That these ldias are derived from Neo - Platonism."(1)

ان نظریات میں جہاں تک یکسانیت کا تعلق ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دو اشیاء میں پائی جانے والی یکسانیت کی بنا پر ایک کو دوسری کی بنیاد یا اصل قرار دے دیا جائے ایسا ممکن نہیں۔ ایک چیز کا دوسری چیز پر اثر تو تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی اصل جڑ یا سرچشمہ مختلف رہے گا۔ جہاں تک مسئلہ تناسخ کا تعلق ہے یہ بالکل بے بنیاد بات ہے کہ مسلمان مسئلہ تناسخ پر یقین رکھتے ہیں۔ بے شک اسماعیلی فرقے کے پیروکار اس عقیدے کو مانتے ہیں، لیکن ان کا یہ عقیدہ صرف اپنے امام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات تک محدود ہے۔ ساری اُمت کے لیے نہیں ہے۔ جبکہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ پوری قوم کے لیے ہے کہ انسان کی موت کے بعد اسکی روح مختلف جانوروں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی تصوّف ہندوؤں کے ویدانتا سے قطعاً متاثر نہیں۔ علاوہ ازیں براؤن کا یہ بیان کہ تصوّف کے زیادہ تر نظریات فارسی سے ماخوذ ہیں، خود اس کے اپنے اس بیان سے ان کی تکذیب ہو جاتی ہے جب وہ کہتا ہے کہ عراقی، احد الدین اکبر فانی اور عبدالرحمٰن جامی جیسے فارسی کے مشہور

1- Nicholoson. A literary History of Arbs Londn - 1907, P.384

صوفی خود محی الدین ابن عربی اور شرف الدین عمر الفارس سے بے حد متاثر تھے۔[1] بالکل اسی طرح تصوّف کا مآخذ نوفلاطونی فلسفے کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

گولڈ زیئر کے خیال میں ابراہیم ادھم کا بادشاہت چھوڑ کر فقیر ہو جانا، مہاتما بدھ کی سوچ اور زندگی سے بہت مشابہہ ہے۔ بدھ کے نظریات نے ابراہیم ادھم کو متاثر کیا تھا۔ یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ میں اصحابِ صُفّہ کی خوبصورت مثال موجود ہے، جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر مسجد نبویؐ کے ایک چبوترے پر بیٹھ کر عبادت و ریاضت میں زندگیاں گزار دیں۔ وان کریمر، گولڈ زیئر، نکلسن اور آندرے کے نزدیک اسلامی تصوّف کی بنیاد نصرانی رہبانیت پر رکھی گئی ہے۔ اس کا جواب قرآن پاک میں موجود ہے۔ ایک آیت ہے۔

" مَایُقَالُ لَکَ اِلَّامَا قَد قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِکَ "

(اے نبیؐ! آپ کو وہی کچھ فرمایا گیا ہے جو آپ سے پہلے پیغمبروں کو فرمایا گیا تھا)

قرآن مجید کا یہ فرمان معترضین کے لیے زبردست جواب ہے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور مکمل دین ہے۔ اس میں ازل سے لے کر ابد تک کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سب کچھ وہ بھی موجود ہے جو قرآن پاک سے قبل اللہ کی جانب سے نازل ہوتا رہا ہے۔

اسلامی تصوّف

حقیقت یہ ہے کہ تصوّف عیسائی رہبانیت سے بالکل مختلف ہے۔ یہ نہ تو عیسائیت سے اور نہ ہی عرب کے زمانہ جاہلیت سے متاثر ہے۔ بلکہ اسلامی تصوّف وہ ہے جسکی تعلیم رسول اکرم ﷺ نے فرمائی ہے۔ لہٰذا اسلامی تصوّف کسی قسم کی آمیزش اور ملاوٹ

1- A Literary History of Percia

سے پاک ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے تزکیہ نفس پر زور دیا اور ریاضت و عبادت کے اصول مقرر کیے۔ علاوہ ازیں تفکر اور ریاضت کے آداب سکھائے اور ان کی خاص صورت وضع فرمائی۔ پھر ان ہی اصولوں پر اسلام کی حیات روحیہ کا آغاز ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کو اس کی بنیاد قرار دیا گیا اور دنیا میں رہ کر دنیا سے بے نیازی کے گر سکھائے گئے۔[1] لہٰذا ہمارے نزدیک صحیح تصوّف وہ ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے اپنی عملی زندگی کے ذریعے پیش کیا۔ آپؐ نے بچپن سے لے کر جوانی تک، جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے لے کر وصال تک زندگی کا ایک ایک پہلو وضاحت سے پیش کیا۔ غار حراء میں عبادت، اعلان نبوت، تجارت، سفر، شادی مبارک الغرض زندگی کا کوئی ایک بھی پہلو ایسا نہیں جس کا نمونہ آپؐ نے پیش نہ فرمایا ہو۔

آپؐ کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا کہ حضور ﷺ کا اخلاق کیسا تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''سارا قرآن حضور ﷺ کا اخلاق ہے''۔ گویا آپ کی حیات طیبہ احکامات قرآنی اور منشائے خداوندی کا عملی نمونہ تھی۔ آپؐ کے بعد آپ کے صحابہ کرام نے قرآن اور سنت کے مطابق زندگیاں بسر کیں۔ خلفائے راشدین اور اصحاب صُفّہ کی زندگیاں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ ان کے بعد تابعین پھر تابع تابعین نے اسی طریق کو اپنایا۔ چنانچہ صحیح اسلامی تصوّف کی جھلکیاں ان بزرگان دین کی زندگیوں سے بھی منعکس ہوتی ہیں۔

تصوّف پر اثرات

شروع شروع میں تصوّف کے مسائل اس قدر پیچیدہ نہیں تھے۔ لیکن جب اسلام عرب کی سرحد عبور کر کے دوسرے ممالک میں داخل ہوا تو پھر اسلامی تصوّف پر مختلف اثرات کا غلبہ ہونے لگا۔ اسکی بڑی وجہ دیگر زبانوں کے علوم وفنون کا عربی و

1- حسنین ہیکل پاشا: حیات محمد، مکتبہ کارواں، لاہور 1964ء

فارسی میں منتقل ہونا تھا۔ بلاشبہ عباسی دور میں بغداد علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ علم و ادب کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے بہت سے علوم وفنون کے تراجم عربی اور فارسی زبانوں میں کئے گئے۔ یوں مسلمان مفکرین دیگر مذاہب کے علوم وفنون سے شناسا اور کسی حد تک متاثر بھی ہوئے جو ایک فطری امر ہے۔ اس زمانے کے بغداد کے علماء یونانی علوم سے کیسے متاثر ہوئے اس کے متعلق نکلسن لکھتے ہیں:

> "That it is mainly a product of greek speculation. Maruf-al-Karkhi, Abu Sulayman at Durani and Dhul-Inun Missri, all these lived and died in the Period (786-861 AD) which begins with the occession of Haran-al-Rashid and is turminated by the death of Mutawakkil. During these seventy five years the stream of Hellenic culture flowed unceasingly into Muslim world. Annumerable works of Greak Philosophers, Physicians and scientists were translated and eagerly studied."(1)

حضرت ابراہیم ادھم بن سلیمان (م 161ھ) نے ترک دنیا، شفیق بلخی (173ھ) نے توکل اور ابوعلی فضیل بن عیاض خراسانی (187ھ) نے محبت سے متعلق جو تصوارت پیش کیے نکلسن نے ان کو بدھ مت کا اثر قرار دیا۔ حالانکہ ابراہم ادھم نے نہ تو دنیا کو ترک کیا اور نہ ہی ترک دنیا کا درس دیا۔ بلکہ انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے یادِ الٰہی کی خاطر گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ ان کے ہاں تارک الدنیا کا کوئی تصور موجود نہیں اور نہ ہی وہ کبھی تارک الدنیا ہوئے تھے۔ یاد الٰہی میں کچھ وقت کے لیے گوشہ گیر ہو جانا

1- A Literary History of Arabs, P.388

سنت رسول ﷺ ہے۔ کیونکہ آپ کئی کئی دن غار حرا میں گوشہ نشین ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ اسی طرح شفیق بلخی اور ابو علی فضیل بن عیاض کا نظریہ بھی قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

اِن اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ (1)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں تصنیف و تالیف کا زیادہ رواج نہ تھا۔ دوسری صدی ہجری میں جب احادیث جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو احادیث کے جمع ہونے کے ساتھ ساتھ تصوّف کے موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ سب سے پہلے حضرت سفیان ثوریؒ (161ھ) کی مندرجہ ذیل چار کتابیں فقہ اور تصوّف کے متعلق سامنے آئیں۔

1- الجامع الکبیر فی الفقہ والاختلاف، 2- الجامع الصغیر، 3- کتاب الفرائض، 4- کتاب التفسیر

بقول خلیق احمد نظامی حضرت سفیان ثوریؒ نے مرتے وقت یہ کتابیں نذر آتش کر دی تھیں۔ (2) اس کے بعد تصوّف کی باقاعدہ کتب دستیاب ہونے لگی ہیں۔ جیسے کتاب اللمع از خواجہ ابوالنصر سراج (م 370ھ) تعرّف از امام ابو بکر بن ابو اسحٰق (م 384ھ) طبقات الصوفیہ از شیخ ابی عبدالرحمٰن السلمی (م412ھ)، رسالتہ القشیریہ از امام ابو القاسم قشیری (م 465ھ) کشف المحجوب از حضرت علی ہجویریؒ داتا گنج بخش (م 465ھ) احیاء العلوم از امام غزالی (م 505ھ) فتوح الغیب اور غنیتہ الطالبین از حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (م 561ھ)، تذکرۃ الاولیاء از شیخ فرید الدین عطارؒ (م620ھ) عوارف المعارف از شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (م 623ھ) فصوص الحکم از شیخ محی الدین ابن عربی (م 628ھ)، فوائد الفواد از خواجہ نظام الدین دہلوی (م 735ھ) اور

1- القرآن پارہ 4 سورۃ آل عمران آیت 159

2- تاریخ مشائخ چشت ص 75

لوائح ونفحات الانس از مولانا عبدالرحمٰن جامؔی (م 898ھ) کی کتب موجود ہیں۔ ان تمام تصانیف کی بنیاد خالصتاً قرآن و حدیث کے مطابق اسلامی تصوّف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگان دین کے بعد آنے والے صوفیائے کرام نے ان تصانیف کو عزّت کی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے فکر کی سمت درست رکھنے کے لیے ان سے راہنمائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی راہنمائی کرتے رہے۔ صوفی شعراء نے ان تصانیف میں بیان کئے گئے موضوعات کو اپنی اپنی شاعری میں بیان کیا۔ چنانچہ اس دور کے بعد کی فارسی ، اردو اور پنجابی کی صوفیانہ شاعری کے موضوعات و تصورات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ ان میں اس قدر گہرا فکری ربط موجود ہے کہ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں معلوم ہوتی ہیں۔ فارسی شاعری میں تصوّف کے مسائل کو رواج دینے والے صوفی شاعروں میں سے ابوسعید ابوالخیر (997 - 1049ء) حکیم سنائی ، مولانا جلال الدین رومیؒ ، خاقانی، انوری، عین الدین ،عراقی ، سعدی ،محمود شبستری اور حافظ شیرازی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اردو شاعری کے آغاز میں صوفیانہ تصورات بہت کم بیان کئے گئے۔ بعد ازاں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ،محمد قلی قطب شاہ (1625 - 1672ء) ، ولی دکنی (1668 تا 1744ء) ،ظہور الدین حاتم (1699 - 1792ء) ، خان آرزو (1689 - 1756ء) ،مظہر مرزا جان جاناں، میر تقی میر، خواجہ میر درد، حیدر علی آتش (1778 - 1847ء) حکیم مومن خان مومن (1800 - 1851ء) اور علامہ اقبال (1877 - 1938ء) کے کلام میں تصوّف کے مضامین موجود ہیں۔

پنجابی شاعری کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کا آغاز ہی ان صوفی شعرا کے ڈیروں اور تکیوں سے ہوا، جنہوں نے تربیت ہی اسلامی تصوف میں پائی اور اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات و تصوّف کے مطابق بسر کی تھیں۔ پنجابی صوفیانہ شاعری کے بانی مبانی حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (1175 - 1265ء) ہیں۔ ان کے بعد شاہ حسینؒ (1539 - 1593ء) نوشہ گنج بخشؒ (1604 - 1691ء)، سلطان باہوؒ

(1631 - 1691ء)، بلھے شاہؒ (1680 - 1758ء)، علی حیدرؒ ملتانی (1690 - 1785ء)، وارث شاہؒ (1707 - 1790ء)، ہاشم شاہؒ (1752 - 1821ء)، میاں محمد بخشؒ (1830 - 1907ء)، مولوی غلام رسول عالمپوریؒ (1849 - 1892ء) اور خواجہ غلام فریدؒ (1841 - 1901ء) کے نام آتے ہیں جن کے اسرار و رموز سے لبریز عارفانہ کلام آج بھی صوفیا کی محفلوں کی جان خیال کیا جاتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب کوئی زبان یا تحریک مرکز سے شروع ہوتی ہے اور دوسرے علاقوں میں پھیل کر وہاں کے باشندوں کی زندگی کو متاثر کرتی ہے اور معاشرے میں تبدیلی لاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہاں کی مقامی معاشرت سے متاثر بھی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان اثرات کو بنیاد بنا کر اگر یہ کہا جائے کہ باہر سے آنے والی تحریک کی جڑ ہی یہ مقامی اثرات ہیں تو قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً پروفیسر موہن سنگھ لکھتے ہیں کہ صوفیاء میں مرشد یا گرو کی اہمیت پر زور دینا ہندو اثر کا نتیجہ ہے۔[1] حالانکہ وہ اس سے قبل خود ہی اس بات کی تکذیب ان الفاظ میں کر چکے ہیں:

> ''صوفی مت (تصوّف) دی پہلی کونپل اسلام دے جنم نال پھٹی۔ عیسائی مذہب، بدھ مت تے ویدانت دا صوفی مت دے نکاس نال کوئی تعلق نہیں تے نہ ای ایہہ صوفی مت دے سومے نیں سگوں اوس اتے پئے اثر نیں۔''[2]

پروفیسر موہن سنگھ کی بات قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ تصوّف میں مرشد کا تصور خالصتاً اسلامی ہے اور عہد رسالتؐ میں مرشد کا نہ صرف تصور تھا بلکہ رواج تھا۔ اگر یہ غیر اسلامی تصور ہوتا تو پھر مسلمانوں میں یہ اس وقت رواج پاتا جب مسلمان برصغیر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر بھی بزرگان

1- ماہنامہ پنجابی ادب (شاہ حسین نمبر) ص 18

2- ایضاً ص 15

دین ،صوفیائے کرام اسلام کا پیغام لے کر برصغیر خصوصاً پنجاب میں وارد ہوئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی سلسلہ طریقت سے وابستہ تھے اور اپنے مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں برصغیر میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ مثلاً حضرت میراں حسین زنجانیؒ، امام الاولیا حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میرؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور دیگر صوفیاء و اولیاء اللہ برصغیر کے ظلمت کدہ میں اسلام کی شمع روشن کرنے کے لیے تشریف لائے۔ ان تمام نے ہندوستان میں تشریف لانے سے قبل اپنے اپنے مرشد سے حقیقت و معرفت کی تعلیم حاصل کی اور سلوک کی منازل طے کی تھیں۔ پھر مرشد کے حکم سے ہندوستان میں داخل ہوئے تا کہ یہاں کے لوگوں کو ذلت و گمراہی کی پستیوں سے نکال کر عزت و آبرو کی رفعتوں سے ہمکنار کریں۔اس سلسلے میں نہایت ٹھوس مثال ہے کہ سر زمین ہندو پاکستان میں قادری ، چشتی، سہروردی ،نقشبندی سلسلے آج بھی جاری ہیں۔ ان میں سے تین سلسلے قادریہ ،چشتیہ اور سہروردیہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شروع ہوتے ہیں جبکہ نقشبندیہ سلسلے کے مقلدین اپنا روحانی سلسلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے نسبت کرتے ہیں۔ یوم یہ تمام سلسلے سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے جا ملتے ہیں جو ہادیٔ کونین ہیں۔

اسلام کا نظام حیات بھی راہبر ، راہنما اور پیرو مرشد کی ضرورت و اہمیت پر زور دیتا ہے۔ بلکہ اسلام کا اہم رکن نماز (صلوٰۃ) بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔جس میں کسی امام یا پیشوا کا ہونا ناگزیر ہے۔ پروفیسر موہن سنگھ نے ایک اور دعویٰ کیا ہے کہ:

> ''رب دی عزت تے ڈرنوں چھڈ کے رب دی بھگتی (محبت) تے
> رب دے عشق اتے زور دینا وی ہندوستان دے پریم مارگ دا اثر
> اے۔''(1)

یہ دعویٰ قطعاً درست نہیں ۔ کیونکہ قرآن مجید فرقان حمید میں اللہ تعالیٰ سے

1- ماہنامہ پنجابی ادب (شاہ حسین نمبر) ص 19

ڈرنے اور محبت کرنے کا درس جگہ جگہ موجود ہے۔ اگر قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی قہاری اور جباری کا ذکر ہے تو دوسری طرف یہ بھی ارشاد موجود ہے کہ:

قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی یُحبِبکُمُ اللّٰہُ وَیَغفِرلَکُم ذَنُوبَکُم وَاللّٰہ غَفُورُرَّحِیم

(ترجمہ): ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

پروفیسر موہن سنگھ اسلامی تصوّف پر ہندومت کے اثرات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روح نوں عقل راہیں نہیں لبھ سکدے۔ روح واسطے کسے دلیل دی لوڑ نہیں۔ آتما سوئے سدھ اے۔ شنکر دا گیان اے۔''(1)

ایسی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ پروفیسر موہن سنگھ بانی اسلام حضورﷺ کی حیات طیبہ کے مطالعے سے محروم ہیں ورنہ ایسا لایعنی بیان کبھی نہ دیتے۔ کیونکہ روح سے متعلق حضورﷺ کا جواب کافی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰﷺ نے جب قریش مکہ کو دعوت اسلام دی تو انہوں نے حجت کے طور پر آپؐ سے بہت سے استفسارات کیے جن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ ''روح کیا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا! ''روح میرے رب کا حکم ہے''۔ یہاں ان امثلہ کے حوالوں سے مقصود یہ ہے کہ تصوّف خالص اسلام کی پیداوار ہے۔ اس کے اشتقاق کے متعلق تمام نظریات باطل ہیں اور ان کی بنیاد محض تعصب ہے۔

o

1- ماہنامہ پنجابی ادب (شاہ حسین نمبر) ص 19

دیسی تصوّف

دیسی تصوّف سے مرداوہ تصوّف ہے جو ہمارے علاقے کے صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے خود اپنایا اور پیش کیا۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ برصغیر پاکستان و ہند میں اکثر صوفیائے کرام بیرونی ممالک سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بڑی کاوشوں سے یہاں کے باشندوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا اسلام کی تبلیغ و اشاعت۔ انہوں نے اس نیک کام میں اپنی زندگیاں صرف کردیں۔ جس کے نتیجے میں ان گنت غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس امر کا اعتراف ڈاکٹر لاجونتی رام کرشنا نے اپنی کتاب ''Panjabi Sufi Poets'' میں کیا ہے۔ کہ:

'' اپنی مرضی نال مسلمان ہون والے سارے لوکی صوفیاں دی تعلیم توں متاثر سن۔''(1)

حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ایں دوحرف لا اِلہ گفتار نیست　　　لَا اِلہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است　　　لا اِلہ ضرب است وضربِ کاری است

مسلمان صوفیاء نے اپنے مقصد کی بجا آوری کے لیے نہایت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ جس کا اعتراف ڈاکٹر لاجونتی رام کرشنا نے یوں کیا ہے:

''صوفیاں دے صبر، بردباری تے پیار نے وڈیاں ذاتاں دے دھتکارے ہوئے نیچ ذات دے ہندوواں نوں اوہناں دا مرید بنا دتا۔''(2)

مسلمان صوفیاء نے برصغیر کے باشندوں کو بت پرستی، شرک و بدعت سے نجات دلائی اور فناہ فی اللہ کا طریق بتایا۔ یہ تمام ثبوت اور دلیلیں محض اس لیے پیش کی

1- پنجابی دے صوفی شاعر ص 7
2- ایضاً

گئیں کہ واضح کیا جائے کہ تصوّف خالصتاً اسلامی تحریک تھی۔ جسے مسلمان صوفیاء اپنے ساتھ لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔صوفیائے کاملین نے اپنی تبلیغی کاوشوں سے سوچ کا جو انقلاب برپا کیا اسی کا فطری نتیجہ تھا کہ جب مسلمان حکمران بیرونی ممالک سے یہاں آئے تو عوامی سطح پر انہیں قبول کیا گیا اور انہوں نے صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ جب ایک قبیلہ ایک مقام سے ہجرت کر کے دوسری جگہ بس جاتا ہے تو اس کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی نظریات مقامی لوگوں کے نظریات سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔جس طرح مغلیہ ادوار کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ اس زمانے میں ہندومسلمان ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مغلیہ خاندان کے بادشاہ دسہرہ اور ہولی کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔

ان حالات میں ایک دوسرے کے عقائد میں تبدیلی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ تبدیلیاں کم اور بعض اوقات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ جیسے خلیق نظامی نے مغلیہ عہد کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''صوفیائے خام کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ انہوں نے نہ صرف مشائخ متقدمین کی روایت کو فراموش کر دیا بلکہ غیر اسلامی فکرو کردار ان کا سرمایہ زندگی بن گیا تھا۔تصوّف کے سرچشمے قرآن وسنت سے ہٹ کر ویدانت اور اپنشد کی طرف منتقل ہوگئے تھے۔عملیات،تعویذ اور گنڈوں میں حد سے زیادہ اعتقاد بڑھ گیا تھا۔ پیر کی غیر شرعی حرکات حجت سمجھی جاتی تھیں۔''(1)

خلیق نظامی نے مغلوں کے اس دور کی صحیح تصویر کشی کی ہے جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے تو یہاں کی ثقافت سے متاثر ہوئے۔ ان کے افکار ونظریات

1- تاریخ مشائخ چشت ص 360

یہاں تک کہ بود باش میں خاصی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔تصوّف میں انہوں نے بھگتی لہر، ویدانت وغیرہ سے اثر قبول کیا۔لیکن ان اثرات کے باوجود مسلمان صوفیائے کرام مثلاً حضرت داتا گنج بخشؒ (465ھ) حضرت خواجہ معین الدین چشتی ؒ اجمیری (633ھ)، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ (633ھ)، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (661ھ)، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ (1265ء)، حضرت خواجہ حمید الدینؒ ناگوری (672ھ)، حضرت مجدد الف ثانیؒ (1043ھ) اور حضرت نوشہ گنج بخشؒ (1014-1103ھ) کی کوششوں سے تصوّف کا اصل ڈھانچہ اسلامی ہی رہا۔ اس کا واضح ثبوت پنجابی زبان کے پہلے شاعر حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے کلام سے ملتا ہے۔ ان کے کلام میں خالص اسلامی رنگ موجود ہے۔ ان کے تصوّف میں خشیت الٰہی، محبت الٰہی اور ایثار جیسے مضمون واضح رنگ میں موجود ہیں۔ اگر ایک جگہ فرماتے ہیں:

اٹھ فریدا وضو ساز صبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نیویں سو سر کپ اتار[1]

تو دوسری جگہ یہ بھی ارشاد کرتے ہیں:

جو بن جاندے نہ ڈراں جے شوہ پریت نہ جائے
فریدا کتی جوبن پریت بن سُک گئے کملائے[2]

بابا فرید کا تصوّف خالصتاً اسلامی ہے جس میں عشق حقیقی کی اہمیت، محبوب ازلی کی محبت، اس کے دیدار کی طلب نمایاں طور پر موجود ہے۔ مثلاً یہ شلوک دیکھئے:

کاگا کرنگ ڈھنڈھولیا سگلا کھایا ماس
ایہہ دوئے نیناں مت چھوہیو پر ویکھن کی آس[3]

1- آکھیا بابا فرید نے ص216
2- ایضاً ص177
3- ایضاً ص236

بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے بعد دیگر صوفیائے کرام نے بھی اسی اسلامی تصوّف کو اپنایا۔ شاہ حسینؒ لاہوری کے کلام میں عاجزی، انکساری کے ذریعے محبوب کے دیدار کی چاہت نقطہ عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کی عملی زندگی کے ملامتیہ رنگ سے انکار ممکن نہیں، لیکن ان کی سوچ، فکر یا تخیل پر کہیں بھی ویدانت اور ہندوازم کا اثر ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی کافیوں میں قدم قدم پر اسلامی تصوّف جھلکتا نظر آتا ہے۔

اڈیا بھور تھیا پردیسی اگے راہ اگم دا
جتھاں میرا شوہ رجھایا تنہاں نہیں بھوجم دا
گوڑی دنیا گوڑ پسارا جیویں موتی شبنم دا
کہے حسین فقیر سائیں دا چھوڑ سریر بھسم دا[1]

حضرت سلطان باہوؒ کے کلام میں بھی اسی انداز کا تصوّف موجود ہے۔ جو خالص اسلامی تصوّف ہے۔

ض: ضروری نفس گُتے نوں قیما قیم کیوے ہُو
نال محبت ذکر اللہ دا دم دم پیا پڑھیوے ہُو
ذکر کنوں رب حاصل تھیندا ذاتوں ذات دسیوے ہُو
دوہیں جہان غلام تنہاں دے باہو جنہاں ذات لبھیوے ہُو[2]

ل: اندر وچ نماز اساڈی بکسے جانتیوے ہُو
نال قیام رکوع سجودے کر تکرار پڑھیوے ہُو
ایہہ دل ہجر فراقوں سڑیا ایہہ دم مرے نہ جیوے ہُو
سچا راہ محمدؐ والا جس وچ رب لبھیوے ہُو[3]

1- کافیاں شاہ حسین ص 28
2- ابیات باہوؒ: مرتبہ سلطان الطاف علی؛ مجلس سلطان باہُو لاہور 1975ء ص 403
3- ایضاً ص 102

ل : اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہوؒ جیں ایہہ بوٹی لائی ہو(1)

ع: عاشقاں ہکو وضو جو کیتا روز قیامت تائیں ہو
وچ نماز رکوع سجودے رہندے سنج صباحیں ہو
ایتھے اوتھے دوہیں جہانیں سبھ فقر دیاں جائیں ہو
عرش کولوں سے منزل اگے باہو پیا کم تنہائیں ہو(2)

ک: کلمے لکھ کروڑاں تارے ولی کیتے سے راہیں ہو
کلمے نال بجھائے دوزخ جتھے اگ بلے ازگاہیں ہو
کلمے نال بہشتیں جاناں جتھے نعمت سنج صباحیں ہو
کلمے جیہی کوئی نہ نعمت باہو اندر دوہیں سرائیں ہو(3)

ان کے علاوہ صوفیاء نے وحدت الوجود کے تصور کی بھی اپنایا بلکہ تمام پنجابی صوفی شعراء نے اسے اپنی فکر کا حصہ بنایا۔ خصوصاً بلھے شاہ تو اس فلسفے کے بے باک مبلغ ہیں۔ ڈاکٹر لاجونتی نے سید بلھے شاہ کے وحدت الوجود سے متعلق ان اشعار کے پیش نظر یکطرفہ فیصلہ دے دیا کہ مسئلہ آواگون کو مسلمان صوفیاء نے تسلیم کر لیا تھا:

1- ابیات باہوؒ ص 63
2- ابیات باہوؒ، ص 433
3- پنجابی دے صوفی شاعر، ص 37

نہ میں مومن وچ مستیاں
نہ میں وچ کفر دیاں رتیاں
نہ وچ بیٹھن نہ وچ بھون
بلھیا کیہ جاناں میں کون (1)

ڈاکٹر لاجونتی نے تصویر کا ایک ہی رخ دیکھا تھا۔ دوسرے رخ پر دھیان ہی نہیں دیا۔ ورنہ ان کا دعویٰ خود بخود غلط ہو جاتا۔ سید بلھے شاہؒ فرماتے ہیں:

اتھے آونا دوجی وار ناہیں
اٹھ جاگ گھراڑے مار ناہیں
ایہہ سون تیرے درکار ناہیں (2)

پنجابی صوفیانہ شاعری کے پس منظر حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ آپ کے فکر کی بنیاد بھی وہ خالص اسلامی تصوّف ہے جس کی اساس سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے قائم کی تھی۔ اسی حوالے سے نوشہ صاحبؒ کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

منن منن حکم دا نوشہ کرے بیان
رب رسولؐ تِس منیا جس منے فرمان (3)
منن دیاں نشانیاں نوشہ دے سنا
صدق صبوری بندگی ، آنن امر بجا
جاں جاں صدق درست ہے تاں تاں درست ایمان
نوشہ کلمہ کفر دا کرے نہ بے ایمان

1- کلام بلھے شاہؒ ص 4
2- ایضاً ص 492
3- گنج شریف ص 249

نوشہ صاحبؒ کے یہ اشعار اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ مسلمان صوفیائے کرام نے مسئلہ تناسخ کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ان کی سوچ کا دھارا مخالف سمت بہتا رہا۔ نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

اِتھوں انت اٹھ جاوناں پھیر نہیں ایتھے آوناں[1]

نوشہ صاحبؒ نے اپنے کلام کے ذریعے نہ صرف مسئلہ تناسخ کو رد کیا بلکہ آخرت میں کامیابی کے لیے انسان کو اس دنیا میں نیک اعمال کرنے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو سینے میں بسانے کا درس دیا:

کرنا ای سو کر لے کھیپ وحدت دی بھر لے[2]
ہر وچ ہر دا نور ویکھ ہکسے دا ظہور ویکھ
ہر وچ ہرنوں ویکھ لے وحدت وچ رب ویکھ لے
بُرا نہ کسے نوں آکھیے سبھ وچ صاحب لاکھیئے
جو چاہے نت خیر ہو سو نوشہؔ نیت نِروَیر ہو

نوشہ صاحبؒ نے اپنے کلام میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ انسان اس دنیا میں جیسے اعمال کرے گا آخرت میں اسے اسکی جزا یا سزا ضرور ملے گی۔ اس دنیا کی زندگی عارضی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں آخرت کی زندگی دائمی ہے۔

نوشہ روز قیامتی تکڑ آئے کھڑووسن
تلسن عمل جو بندیاں وزن اندازہ ہووسن[3]
ہک ول پاسن نیکیاں ہک ول بدیاں پاوسن
عملاں تولن کار نے ملک تکڑ نوں چاوسن

1- گنج شریف ص 452
2- ایضاً
3- ایضاً ص 250

چنگے عمل نہ ودھسن ودھسن عمل گناہ دے
پھر کلمہ پوسی نیکیاں نال حکم اللہ دے
تاں ودھ ہوسن نیکیاں اوہ چھابا گورا ہووسی
کلمہ مہر دا مہنگا سب گناہواں نوں دھووسی
ظلم نہ اوتھے بخشیئے ایہہ نہیں رب بھاوندا
مہر محبت بندگی ایہہ خاوند نوں خوش آوندا
کلمہ پڑھیاں رسول دے رب راضی خاوند ہویا
کلمہ پاک پڑھائیکے درگاہِ نوشہ ڈھویا
نوشہ جس دی طلب ہو آوے اوہو یاد
طالب قادر پاک دا یادوں لئے سواد
جے تیں طلب خدائے دی اٹھ پہر کریاد
یاد بناں جو طلب ہے نوشہ سو برباد
نوشہ طلب خدائے دی دیوے لکھ مراد
دین دنی اوہ پاوندا کرے جو خاوند یاد

بابا فرید الدین گنج شکرؒ، شاہ حسینؒ، نوشہ گنج بخشؒ، سلطان باہوؒ اور ان کے بعد آنے والے تمام صوفی شعراء مثلاً بلھے شاہؒ، علی حیدرؒ، فرد فقیرؒ، اور ہاشم شاہؒ نے مقامی اثرات ضرور قبول کیے مگر یہ اثرات اظہار کے طریقوں تک ہی محدود رہے اور اسلامی تصوّف کے محل میں کسی قسم کی کوئی دراڑ نہ پیدا کر سکے۔ اس لیے بے حد وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی صوفیانہ شاعری کے ذریعے جو تصوّف پیش کیا گیا وہ خالص اسلامی ہے اور اسی اساس پر نوشہ گنج بخشؒ نے شاعری کی۔ ان کے کلام میں اگرچہ بے شمار موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً توحید، رسالت، کلمہ طیبہ، دنیا کی بے ثباتی، صبر ورضا، فکر و ذکر، توبہ، فقر فقیری اور درویشی، مسئلہ تناسخ کا رد اور ہندومت پر چوٹ

وغیرہ، لیکن ان کے علاوہ نوشہ صاحبؒ نے جن خاص موضوعات پر کھل کے لکھا ہے ان میں مرشد کا ذکر، کلمے کا ذکر اور مسئلہ وحدت الوجود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں پہلے ان تین موضوعات کا جائزہ پیش کیا جائیگا۔ جن پر نوشہ صاحبؒ نے زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے بعد دیگر موضوعات کے متعلق گفتگو ہوگی۔

کلمہ طیبہ (توحید و رسالت) کا ذکر

دین اسلام کی بنیاد کلمہ ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ کلمے کا زبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے۔ کلمے کی ابتداء ہی توحید کے درس سے ہوتی ہے۔ بندہ سب سے پہلے لاالـہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہے۔ توحید کے اس زبانی اقرار سے نہ تو توحید کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ ہی بندے کو توحید کا مکمل ادراک ہوتا ہے۔ لہٰذا توحید کا مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔

کلمے کے دو حصے ہیں۔ پہلا توحید اور دوسرا رسالت۔ نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے کلمہ توحید کی تعلیم فرماتے تھے۔ اگر ہم کائنات کی تخلیق اور لوگوں کی اصلاح اور فلاح کے لیے آنے والے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی آمد پر غور کریں تو نتیجہ کلمہ توحید ہی حاصل ہوتا ہے۔ توحید کی تعلیم کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرماتا رہا۔ انبیاء کرام نے نہ صرف خود توحید کا اقرار کیا بلکہ لوگوں کو بھی اسی کی تعلیم بھی دی اور اس کے لیے کسی قسم کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا آتش نمرود میں چھلانگ لگانا، حضرت اسماعیلؑ کا اپنے گلے پر چھری رکھوانا، حضرت زکریاؑ کا آرے سے چیرے جانا، حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا، حضور ﷺ کا ہجرت کرنا، غزوہ احد میں دندان مبارک شہید ہونا، یہ سب کلمہ توحید پر یقین کامل کے عملی مظاہروں کی بہترین امثلہ ہیں۔ لہٰذا جب تک انسان خلوصِ دل سے لاالـہ الا اللہ کا اقرار نہیں کرتا اس پر کائنات کے اسرار و رموز اور ربِ کائنات کی دوامیت کے راز کبھی منکشف

نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے کلمہ توحید پر بے حد زور دیا ہے اور اس کے فیوض و برکات کو وضاحت وصراحت سے بیان فرماتے ہوئے اسے اسلام کا پہلا رکن قرار دیا ہے۔ آپؐ نے کلمہ توحید کے ذکر کو جملہ اذکار سے افضل فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ:

''میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ کروں گا جب تک لاالـــہ الا الله کا اقرار نہ کر لیں۔''

حدیث قدسی ہے:

" لَـوانِ السّـمَـوَاتِ السَّبْعَ وَ عَامِرَ هُنَّ غَيْرِى وَالارْضِيْنَ السَّبْـعَ وَضِـعْنَ فِى كَفةٍ وَلَا اِلْـــهَ اِلَّا اللّٰهُ فِى كَفْةٍ لَمالَتْ بِهِنَّ لااِلٰـــهَ اِلَّا اللّٰـهُ"

ترجمہ: اگر سات آسمان اور سات زمینیں اور جو کچھ ان کے مابین موجود ہے ان سب کو ترازو کے ایک پلے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلے میں کلمہ رکھ دیا جائے تو کلمے والا پلہ بھاری ہوگا۔

اس حدیث کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی ؒ فرماتے ہیں کہ کلمے کی فضیلت کا سبب یہ ہے کہ:

''چرا افضل نباشد و راجح نیاید کہ یک کلمۂ آں (لاالہ) نفی جمیع ماسوائ می نماید چہ سمٰوات چہ ارضین و چہ عرش و چہ کرسی و چہ لوح و چہ قلم و چہ عالم و چہ آدم و کلمۂ دیگر آں (الاّ اللــہ) اثبات معبود بحق مے فرماید جل برہانہ کہ خالق السمٰوات و ارضین است و ماسوائے حق جلّ و اعلیٰ ہر چہ ہست از آفاق و انفس متجلّی شود بطریق اولیٰ چند و چوں خواہد بود کہ شایان نفی است۔''(1)

1- مجدد الف ثانی۔ مکتوبات دفتر دوم مکتوب 9

توحید کا مسئلہ جس قدر زیادہ مشکل اور ادق تھا، صوفیاء کرام نے اسی قدر اس پر زیادہ توجہ دی۔ اسے سمجھا اور لوگوں کو سمجھایا۔ حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں:

''حقیقت توحید حکم کردن بر یگانگی چیزے وصحتِ علم بر یگانگی آں چوں خداوند تعالیٰ یکے است، بے قسم اندر ذات وصفات خود و بے بدیل و شریک اندر افعال خود، وموحدان ویرا بدیں صفت دانستہ اند، دانش ایشاں را بہ یگانگی توحید خواندہ اند''[1]

حضرت ابو العباس قاسمؒ بن المہدی الیادی کا قول ہے:

''توحید یہ ہے کہ دل میں کوئی چیز بجز خدا راہ نہ پائے''[2]

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:

''التَّوحِیْدِ افرادُ القدِیْم عَنَ المُحْدَث ''یعنی توحید یہ ہے کہ قدیم (واجب الوجود ہستی) کو (ممکن الوجود ہستی) سے جدا کر دیا جائے۔''[3]

حسین بن مصنور حلاج کا قول ہے:

'' جو شخص حقیقت توحید سے آشنا ہو جاتا ہے اس کے دل اور زبان سے کم و کیف چون و چرا ساقط ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ نہ احکام الٰہی میں چون و چرا کرتا ہے اور نہ ہی حوادث دہر ومقدرات میں۔ ہر حال میں اللہ سے راضی رہتا ہے اور ہر حکم اور تقدیر کے سامنے گردن تسلیم خم کر دیتا ہے۔[4]

کلمہ توحید اس لیے بھی افضل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شئے کی

-1 کشف المحجوب ص216
-2 ایضاً اردو ترجمہ ایف ڈی گوہر ص147
-3 یوسف سلیم چشتی پروفیسر: تاریخ تصوف؛ علما اکیڈمی محکمہ اوقاف لاہور 1976ء ص226
-4 ظفر احمد عثمانی مولانا: سیرت منصور حلاج، کراچی 1397ھ ص151

نفی کرتا ہے۔ کلمے کا دوسرا حصہ اللہ تعالیٰ کے اثبات کا اقرار ہے جو زمین و آسمان کا خالق و مالک ہے اور کائنات کی ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔

قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سے قبل بھی جملہ انبیاء کرام نے لا الہ الا اللہ پر بے حد زور دیا ہے لیکن قرآن پاک نے توحید کے ایجابی پہلو کے ساتھ ساتھ سلبی پہلو کی جو تاکید فرمائی ہے اس کی وجہ سے توحید کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔ ایجابی پہلو سے مراد ہے کہ خداوند کریم ہے اور وحدہ لاشریک ہے۔ سلبی پہلو سے مراد یہ ہے کہ اس کے علاوہ اس جیسا کوئی نہیں۔ جبکہ اس جیسا اور کوئی نہیں ہے تو پھر اسکی صفات میں کسی دوسرے کو شریک نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ہمارے سامنے جب قرآن پاک لا الہ الا اللہ کا واضح تصور پیش کر رہا ہے تو اس کے ساتھ انسانی ذہن کے پیدا کیے ہوئے غلط اور باطل عقائد کو بھی ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ پھر ان باطل عقائد کی تردید بھی دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔ ہم نے اسکے لیے ابھی ایجابی اور سلبی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ کلمہ توحید کا سلبی پہلو یہ ہے کہ کلمہ انسان کے ذہن میں موجود غیر فطری تصورات سے مکمل انکار کرواتا ہے۔ جب انسان کے دل سے باطل نقوش محو ہو جاتے ہیں تو پھر ایجابی پہلو کے ذریعے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرواتا ہے۔ جو کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اور وہی عبادت کا لائق ہے۔ وہی حاجت روا ہے۔ جب کسی انسان کے دل میں یہ عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے تو وہ مومن بن جاتا ہے۔ لہٰذا سچا مومن وہی ہے جو ارادے کامل کے ساتھ اللہ کو معبود تسلیم کرے اور اپنی تمام خواہشات کو اسکی رضا پر چھوڑ دے اور دل سے اقرار کرے کہ عزت و ذلت، فتح و نصرت، موت و زندگی، رزق و اولاد، تنگی و فراوانی سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ انسان بنیادی طور پر بے حد کمزور اور ناتواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی شعراء نے اپنے لیے عاجز، فقیر یا درویش جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس لیے لا الہ الا اللہ کی حقیقت کا ادراک ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ زبانی اقرار سے نہ تو کلمہ کے

صحیح تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ ہی مدعا حاصل ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

ایں دو حرف لا الہ گفتار نیست — لا الہ جُز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است — لا الہ ضرب است وضرب کاری است
در مقام لا نیا ساید حیات — سوئے اِلاّ مے خرامد کائنات
لاَ و اِلاّ ساز و برگِ اُمتاں — نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

کلمہ توحید کی برکات وفضائل

حق تعالیٰ کی پہچان کا سب سے اہم ذریعہ کلمہ توحید ہے۔ اس لیے تمام انبیاء کرام نے لا الہ الا اللہ کی تبلیغ کی۔ اگرچہ ان کے راستوں میں انسانی ذہن کے تخلیق کئے ہوئے معبودوں نے رکاوٹیں پیدا کیں۔ لیکن بقول علامہ اقبالؒ:

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ اُو
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ اُو

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ کلمہ نفی یعنی لا کا حق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادا کیا، اور انہیں امام الانبیاء کے لقب سے نوازا گیا۔ جبکہ کلمہ طیبہ یا کلمہ توحید کے اثبات (الا اللہ) کا حق سرور کائناتﷺ نے ادا کیا:

''کلمۂ نفی را حضرت خلیل علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام کرد و ہیچ درے از درہائے شرک نگذاشت کہ مسدود نساخت، لہٰذا امام الانبیاء آمد علیہم الصلوٰۃ والتحیات۔ چہ نہایت کمال دریں نشاۃ منوط باتمام ایں نفی است زیرا کہ ظہور کمالاتِ کلمہ طیبہ اثبات موقوف نشاۃ آخرت است۔ غایت مافی الباب چوں خاتم الرسل علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات دریں نشأۃ بدولت روائت مشرف گشت۔ از کمالاتِ کلمہ طیبہ اثبات دریں نشأۂ نیز نصیب وافر یافت''(1)

1- مکتوبات دفتر دوم مکتوب 9

کلمہ توحید کی فضیلت کے متعلق سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

"من قال لااله دخل الجنة" یعنی جس نے لا الـه الا الله پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔"

مجدد الف ثانی ؒ ،حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض تنگ نظر لوگ تعجب کرتے ہیں کہ ایک بار کلمہ پڑھنے انسان کیسے جنت میں جا سکتا ہے؟

مجدد الف ثانی ؒ اس مشکل سوال کا یوں جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کلمہ طیبہ کی حقیقت اور برکت سے آگاہ نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کلمے کی شان ، برکت اور جلال اس قدر ہے اگر حضور اکرم ﷺ کلمے کے ایک ہی ورد سے پوری کائنات کی بخشش اور جنت کی بشارت دے دیتے تو بھی اس میں گنجائش باقی رہتی۔ اس کلمے کے فیوض و برکات اگر پوری کائنات میں تقسیم کر دیئے جائیں تو قیامت تک کائنات کی ہر شے ان سے مستفید ہوتی رہے گی۔[1] بقول حضرت مجدد الف ثانی اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کلمہ طیبہ سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں:

"ہیچ چیزے در تسکینِ غضب رب جل سلطانہٗ ازیں کلمہ طیبہ نافع تر نیست"[2]

بلکہ کلمہ طیبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے 99 حصوں کی کلید ہے اور کلمہ طیبہ کی بنا پر امت مسلمہ کو قیامت کے روز حضور اکرم ﷺ کی شفاعت نصیب ہوگی۔

"ایں کلمہ طیبہ را کلید خزینہ نود ونور رحمت کہ برائے آخرت ذخیرہ فرمودہ است ..... ہلاک مے گشت۔ ایں اُمتِ پُر گناہ اگر مثل کلمہ طیبہ شفیعِ ایشاں نمے بود ومثل خاتم الرسل علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات و

1- مکتوبات دفتر دوم مکتوب 37

2- ایضاً

التحیات شفاعت شاں نمے بود''۔ (1)

حضرت سلطان باہوؒ اپنی کتاب امیر الکونین میں فرماتے ہیں:

''ہر دو جہاں علم کی قید میں ہیں اور علمِ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قید میں ہے۔ اور کلمہ طیب اسم اللہ کی قید میں ہے۔ جو شخص کلمے کو دلی تصدیق سے پڑھتا ہے اور کلمہ طیب کی کُنہ جانتا ہے اس سے کوئی علم بھی مخفی نہیں رہتا۔''(2)

اسی طرح مولانا گل حسن شاہ تذکرہ غوثیہ میں کلمہ طیبہ کو سامنے رکھتے ہوئے توحید کے متعلق فرماتے ہیں کہ توحید چار طرح کی ہے:

''توحید کا اول مرتبہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے لا الہ الا اللہ کہے مگر دل اس سے غافل ہو یا منکر مثل منافقین کے۔ مرتبہ دوم یہ ہے کہ اس کلمے کے معنی کو دل سے سچ جانتا ہو۔ جیسے عوام مسلمان اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ مرتبہ سوم یہ ہے کہ بذریعہ نورِ حق یہ معنی کشف کے طور پر مشاہدہ ہو جائیں۔ یہ مقام مقربین کا ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ اشیاء کو کثیر تو جانتا ہے مگر باوجود کثرت کے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے۔ مرتبہ چہارم یہ ہے کہ جملہ موجودات کے وجود میں بجُز ذات واحد یکتا کے اور کسی کو نہ دیکھے۔ (3)

اسی لیے بزرگان دین نے کلمے کی بے حد تلقین فرمائی ہے۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے اپنے کلام میں کلمہ کو صحیح طریقے سے پڑھنے اور اسکی حقیقت کو سمجھنے پر جس قدر زور

1- مکتوبات دفتر دوم مکتوب 37

2- سلطان باہوؒ، امیر الکونین اردو ترجمہ اللہ والے کی قومی دکان لاہور 1332ھ ص 29

3- گل حسن شاہ: تذکرہ غوثیہ؛ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1968ء ص 139

دیا ہے اسکی مثال دیگر صوفی شعراء کے ہاں کم ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو نوشہ صاحبؒ کا وہ تبلیغی مقصد تھا جس کے حصول کے لیے انہوں نے پوری زندگی وقف کر دی اور دوسری وجہ اس لادینی طوفان کا سد باب تھا جو بادشاہ اکبر کے عہد سے چلا آ رہا تھا اور جس نے اسلامی تعلیمات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ شروع شروع میں اکبر اسلامی عبادات کا پابند تھا۔ اس کے دربار میں نماز باجماعت ہوتی تھی۔ وہ علماء کا قدردان اور بزرگان دین سے بے حد عقیدت و ارادت رکھتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ پیدل چل کر حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مزار پر حاضری دی۔ اس کے دربار میں ملا عبداللہ سلطان پوریؒ، مخدوم الملکؒ اور ملا عبدالنبیؒ، ''صدر جہان'' [1] کے عہدوں پر فائز تھے۔ لیکن جس وقت مختلف فرقوں کے علماء نے دربار کو مناظروں کا اکھاڑہ بنا لیا تو شہنشاہ اکبر جو علمِ دین سے پوری طرح بہرہ مند نہ تھا، علماء سے بد دل اور دین سے غافل ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دین اسلام سے برگشتہ ہوگیا۔ ملا مبارک ناگوری اور ان کے دو بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے موقع غنیمت جان کر اکبر کا قرب حاصل کر لیا۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے ایک محضر نامے پر تمام علماء کرام کے دستخط حاصل کر لیے اور اسکی رو سے شہنشاہ اکبر کو مجتہد اور امام بنا دیا۔ اکبر نے مجتہد اور امام کا عہدہ سنبھالتے ہی اسلامی عقائد، حشر، معجزات، ثواب عذاب، جنت دوزخ کا نہ صرف خود مذاق اڑانا شروع کر دیا بلکہ بھرے دربار میں ان پر مباحث شروع کرا دیئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بھرے دربار میں آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیاں ہونے لگیں۔ ملا عبدالقادری بدایونیؒ نے لکھا ہے کہ کفار اور خواتین کی خوشی اور خوشنودی کے لیے وہ آنحضرت ﷺ کا نام مبارک بھی زبان پر لانا گوارا نہ کرتا تھا:

''نام احمد و محمد و مصطفےٰ ﷺ و امثال آں بجہت کافراں بیرونی و زنانِ

1- یہ حضرت عبدالقدوس گنگویؒ کے پوتے تھے۔

اندرونی گراں می آید''[1]

علماء اپنی کتابوں میں خطبہ لکھنے سے ڈرتے تھے۔ صرف توحید اور بادشاہی القاب ہی کافی خیال کئے جاتے تھے اور حضور اکرم ﷺ کا اسم مبارک زبان پر لانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ بعض ہندو اور ہندونواز مسلمان آنحضرت ﷺ کی نبوت پر کھلم کھلا اعتراض کرتے تھے۔ دیوان خانے میں کسی کو نماز ادا کرنے کے جرأت نہ تھی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''علمائے سوء در تصنیفات از خطبہ تبرّ امے آوردند و اکتفا بہ توحید کردند و القاب پادشاہی مے نوشتند۔ و مجال نبود کہ نام آنحضرت صلعم علی الرغم مکذبین بہ برند۔''[2]

پھر رقمطراز ہیں:

''بدبختے چنداز ہندوواں و مسلمانان ہندو مزاج قدح صریح بر نبوت می کردند۔ در دیوان خانہ ہیچ کس یارائے آں نماشت کہ اعلانیہ ادائے صلوٰۃ کند''[3]

حج نماز روزہ اس سے پہلے ہی ساقط ہو چکے تھے۔

''نماز، روزہ، حج پیش ازاں ساقط شدہ بود''[4]

ابوالفضل اور فیضی نے بادشاہ اکبر کو مجتہد سے بڑھا کر نبوت کے مقام پر فائز کر دیا۔ اور اس نے نبوت سنبھالتے ہی ایک نئے دین کا آغاز کیا۔ جسے تاریخ میں دین الٰہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فیضی کے اس شعر سے واضح ہے کہ اکبر کی نبوت اور

1- عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ جلد دوم نولکشور لکھنو 1284ھ جلد دوم ص 125
2- ایضاً ص 269
3- ایضاً ص 315
4- ایضاً ص 251

دین الٰہی نے کیا رخ اختیار کیا۔

شکر صد شکر کہ خیر البشرے پیدا شد
یک نبی رفت پسِ او دگرے پیدا شد

اکبر نے اپنے عہد سلطنت میں عیسائی مجوسی ہندو اور دیگر مذاہب کے علماء اپنے دربار میں جمع کئے۔ ان کے آپس میں مناظرے کرائے۔ اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے انجیل کا ترجمہ کیا اور زرتشت مذہب کے پیرو کاروں کی دلجوئی اور خوشنودی کے لیے شاہی محل میں آتش کدہ تعمیر کیا گیا۔ اکبر نے پرتگیزی پادریوں کو تحریر اور تقریر کی اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ وہ بھرے دربار میں تہذیبی اور اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسلام اور اسلام کے بانی آنحضرت ﷺ کی شان مبارک میں گستاخی کرتے تھے۔ اس قسم کی باتوں سے دربار میں موجود مسلمانوں کے دل کڑھتے تھے لیکن کسی کو ان پادریوں کا منہ بند کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ (1)

یوں اکبر نے مختلف مذاہب میں سے اپنی پسند کے اصول یکجا کیے اور دین اسلام سے بالکل بے توجہی اختیار کر لی اور اسلامی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ مختلف مذاہب کے اصولوں کے تال میل سے ایک نئے دین کی اساس رکھی گئی۔ اکبر اعظم کا یہ فعل بے شک سیاسی تھا اور اسکی حکمت عملی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تمام مذاہب کا احترام محض اس لیے کرتا کہ رعایا بغاوت نہ کرے اور اس کی مطیع و فرمانبردار رہے۔ اکبر کے اس رویے کو اسلامی مساوات کی تعلیمات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اکبر تو اسلام سے بہت عرصہ پہلے بے اعتنائی اختیار کر چکا تھا۔ لیکن یوں اسلام سے بے رخی اختیار کرنا شاید اس قدر نقصان دہ نہ تھا جس قدر اسلام کا تمسخر اڑانے اور دین اسلام کے سنہری اصولوں کو گڈ مڈ کرنے اور ان کی شکل بگاڑنے سے ہوا۔ اسی لیے اکبر کی ان پالیسیوں کے باعث پانچ چھ سالوں ہی میں اکبری دربار میں اسلام کا نام و نشان باقی نہ

1- تفصیل کے لیے دیکھئے M. Payne کی کتاب Akbar and the Jesuits ص 84

رہا۔ اکبر کے دین الٰہی کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔ اس کے دین کا کلمہ یہ تھا۔ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ۔ نیز السلام علیکم کی جگہ پیرو کار اللہ اکبر کہتے تھے۔ بادشاہ کو سجدہ کیا جانے لگا۔ فتویٰ سے بچنے کے لیے سجدہ کی جگہ زمین بوسی کی اصطلاح تراشی گئی۔ بادشاہ کی زیارت مرادوں کا قبلہ اور حاجتوں کا کعبہ قرار دی گئی۔ اس ضمن میں بدایونی لکھتے ہیں:

''سجدہ برائے او تجویز کردہ۔ آں را زمیں بوس نام دہند و رعایت ادب بادشاہ را فرض عین شمردہ، روئے او را کعبۂ مرادات و قبلۂ حاجات دانیدند۔ و بعض روایات و عمل مریداں بعض مشائخ ہند را دریں باب بتمسک آوردند۔''(1)

جب بادشاہ اکبر نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں تو وہ ماتھے تلک لگا کر مندر بھی جانے لگا۔ وہ وضع قطع اور بود و باش سے بالکل ہندو نظر آتا تھا۔ اکبر کی اس حکمت عملی اور اسلام کا حلیہ مسخ کرنے سے مسلمان اس سے سخت نالاں تھے۔ لیکن اکبر اس ہیئت کذائی کے باوجود ہندوؤں کو خوش نہ رکھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کی موت کے فوراً بعد اس کے خود ساختہ اصول اور قوانین اپنی موت آپ مر گئے۔ تاہم ان میں سے بعض مشرکانہ رسومات جہانگیری عہد تک جاری رہیں۔ جن کے بارے میں شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''یہ امر قابل ذکر ہے کہ مریدان شاہی بالخصوص درشنیوں کا تھوڑا بہت سلسلہ اکبر کے بعد بھی جاری رہا۔''(2)

ان قبیح رسومات میں سے بادشاہ کو سجدہ کرنے والی رسم جہانگیر کے زمانے

1- منتخب التواریخ ص 259

2- شیخ محمد اکرام: رود کوثر: لاہور 1958ء ص 132

میں بھی جاری رہی۔ تزک جہانگیری کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ جہانگیر بھی دیگر مشرکانہ رسومات کے ساتھ ساتھ عوام کے سجدے کو جائز اور سعادت سمجھتا تھا۔ جس کے خلاف مجدد الف ثانیؒ نے آواز اُٹھائی جس کی پاداش میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں اُٹھانا پڑیں۔ بالآخر اسے مجدد صاحبؒ کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور اس نے اسلام کے خلاف امور پر پابندی لگانے کی سعی کی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اس کارنامے نے بلاشبہ حالات کا دھارا بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن دربار میں ہندوؤں کا غلبہ، ابوالفضل اور فیضی کی پھیلائی ہوئی فسلفیانہ علمی موشگائیوں کے جادو سے بچ نکلنا آسان کام نہ تھا۔ مجدد صاحبؒ نے لوگوں کو صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کا درس دیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی منڈلاتا تھا کہ جہانگیر کی موت کے بعد دربار پر بے دین لوگوں کا قبضہ نہ ہو جائے۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بادشاہی رعب و جلال کے باعث درباریوں کو راہ راست پر تو لایا جا سکتا ہے لیکن عوام میں سرایت کیے ہوئے غلط عقائد اور نظریات کو تبدیل کرنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دشوار کام جہانگیری عہد کے بعد شاہ جہان کے زمانے میں حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے انجام دیا۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کے دلوں میں کلمہ طیبہ کو راسخ کیا بلکہ بقول گارساں دتاسی انہوں نے تقریباً دو لاکھ لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ اگر اس سارے پس منظر کی روشنی میں حضرت نوشہ صاحبؒ کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ کلمے پر اس قدر زور کیوں دیا۔

کلمہ دین کی بنیاد اور جڑ ہے۔ اس کے بغیر کسی شخص کے مسلمان ہونے یا ایماندار ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نوشہ صاحبؒ نے کلمے کی تصدیق کیساتھ ساتھ اسکی مختلف جہتیں بھی بیان کی ہیں۔ اسکی برکات و فیوض کی وضاحت کی ہے۔ بار بار کلمے پر زور دینے کا مقصود و مطلوب یہی تھا کہ لوگوں پر توحید باری تعالیٰ اور رسالت ﷺ کے مرتبے کو واضح کیا جائے اور ان کے ایمان میں ایقان و پختگی پیدا کی جائے۔ جیسا

کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اکبری عہد میں دینِ اسلام اور کلمے کا جس طرح تمسخر اڑایا گیا اس نے معاشرے پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ بعض اہل قلم کی رائے میں اکبر کے اس رویے کے خلاف شاہ حسین لاہوریؒ نے احتجاجاً ملامتیہ رنگ اختیار کیا جبکہ جہانگیر سے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حضرت مجدد صاحبؒ کے بعد اس امر کا خدشہ ضرور موجود تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گہرے رابط کے باعث یہ فتنہ پھر سر نہ اٹھا لے۔ اس فتنہ کو روکنے کے لیے لوگوں کو دین اسلام کے بنیادی عقائد سے روشناس کرانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ حضرت نوشہ صاحبؒ نے یہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی۔ انہوں نے کلمے کے حوالے سے لوگوں کو جو درس دیا اس کا سب سے پہلا اور اہم نکتہ یہ ہے کہ کلمہ حقیقت میں وہی ہے جو عہد رسالتؐ سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی شخص کو کوئی حق حاصل نہیں۔ اگر کوئی حاکم کلمے کو مسخ کرنے یا تبدیل کرنے کی کوشش کرے تو اسکے خلاف جہاد لازم ہے۔ حاکم اس سلسلے میں خواہ کتنا ہی ظلم و ستم کرے مسلمانوں کو اپنے عقیدے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے اور نہ ہی کسی قسم کے خوف اور لالچ کی وجہ سے استقامت میں لغزش آئے۔

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

نت بولے نال یقین دے ڈولے نہیں نوشاہ[1]

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرشد سچے آکھیا سچا کلمہ آکھ — سچا کلمہ آکھیاں سچی ہووے ساکھ[2]
مرشد سچے آکھیا سچا کلمہ بھر — سچا کلمہ آکھیاں موتوں ذرا نہ ڈر
مرشد سچے آکھیا سچا کلمہ بول — سچا کلمہ آکھیاں ہک ذرا نہ ڈول

1- گنج شریف ص252
2- ایضاً ص498

کلمے اندر آیا رب رسول دا نام
ہور نہ نام رلایئے نوشہ کرے کلام[1]

اصل کلمہ وہی ہے جس کے پہلے حصے میں توحید، یعنی رب کے معبود ہونے کا ذکر ہے دوسرے حصے میں رسالت مآب ﷺ کی رسالت کا ذکر ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں، اگر تبدیلی کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوگی۔

کلمے دے وچ آیا اللہ محمدؐ دا ناؤں — ہور کسے دی ایس وچ نوشہ نائیں تھاؤں[2]
کلمے وچ شریک نہ نوشہ کوئی ہور — اللہ پاک محمدؐ نیں سدا ایہناں نوں سَور
کلمہ منن رب دا تے منن پاک رسولؐ — نوشہ اوہناں منیاں جو درگہ دے مقبول[3]
سچی صفت رسول دی جیہڑی ضرور ایمان — سچا کلمہ آکھیاں مشکل کل آسان[4]
سچا کلمہ ایہہ ہے کہے فقیر نوشاہ — لا الٰہ الااللّٰہ محمّدُ رسول اللّٰہ[5]

نوشہ صاحبؒ کے نزدیک جب انسان کلمے کی اہمیت اور اسکے مخفی حقائق سے آشنا ہو جاتا ہے تو پھر اس پر کائنات اور خالق کائنات کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور اس حقیقت کو پا لینے کے بعد انسان محض مٹی کا پُتلا نہیں رہ جاتا بلکہ قرب الٰہی حاصل کر کے گراں بہا موتی بن جاتا ہے۔ یہاں نوشہ صاحبؒ خوبصورت مثال پیش کرتے ہیں کہ جس طرح لوہا پارس سے چھونے کے بعد کندن بن جاتا ہے اور وہ بیش قیمت ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جب انسان کلمے کی حقیقت سے آشنا ہو کر اسکی مقتضیات کو پورا کرتا ہے تو وہ اس کائنات میں بیش قیمت بن جاتا ہے۔ دنیا

1- گنج شریف ص 508
2- ایضاً ص 481
3- ایضاً ص 507
4- ایضاً ص 506
5- ایضاً ص 485

کی ہر چیز اسکے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے اور اس وقت وہ صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق بنتا ہے:

کلمہ پارس کیمیا ایہہ تن لوہا مِس
ادنیوں اعلیٰ ہویا کلمہ آ کھیا جس[1]

کلمہ سے انسان کو نہ صرف اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے بلکہ تمام دنیاوی سہاروں اور جھوٹے خداؤں سے بے نیاز کر کے سکون کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ نیز آخرت میں کامیابی کا راز بھی کلمہ میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا جو شخص کلمے کو اپنا لیتا ہے اور اس کے ورد کو حرزِ جاں بنا لیتا ہے تو دنیاوی کامیابی کے ساتھ ساتھ آخرت کی کامیابی بھی اس کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ دوزخ کی آگ اس پر حرام ہو جاتی ہے اور جنت ٹھکانہ بن جاتی ہے۔

کلمہ اگ دوزخ دی ٹھارے وچ بہشت دے محل اسارے[2]
بہشت اساڈے اندر وسّے دوزخ لکھ سَے کوہیں نسے
بہشتیں ساڈا ہے بسرام دوزخ ساتے ہویا حرام
نہ کوئی خوف نہ ڈر
نوشہ کلمہ حضرت دا بھر

o

کُل چِٹھا معافی والا پاک محمدؐ لیایا
کلمہ پڑھے سو بہشتے داخل آپ رسول فرمایا[3]

o

1- گنج شریف ص255
2- ایضاً ص496
3- ایضاً ص505

کلمہ گو نہ دوزخ پوسی وحی پیغام پہنچایا
نوشہ کہے کلمے دے صدقے اساں چھٹکارا پایا

کلمہ بہشتاں وچ پہنچاوے دوزخ کولوں دیوے امان
کلمہ جیہا مترّ نہ کوئی حاجی نوشہ کرے بیان (1)

جب کوئی شخص کلمہ پڑھ لیتا ہے تو اس کے سابقہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان صمیم قلب کیساتھ کلمے کا ورد کرے تو گناہ اس کے قریب نہیں بھٹکتے۔ جب گناہ انسان سے دور رہیں گے تو وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔ اسی لیے کلمہ پڑھنے والوں کو بہشت کی بشارت دی گئی ہے۔

کلمہ پڑھیاں سن سچیارا کوئی گناہ نہ پوہے
وچ سمندر دے مٹھ مٹی دی آمیاں کیا کھوہے (2)
کلمہ دوزخ پون نہ دیندا جیہناں پڑھیا جانن اوہے
نوشہ بہشت کلمے دی کھٹی کلمہ گوواں نوں سوہے

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے ہمعصر حضرت سلطان باہوؒ نے بھی اپنے ابیات میں کلمے کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ وہ کلمے کو دوزخ سے محفوظ رہنے اور بہشت میں داخل ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں:

ک: کلمے لکھ کروڑاں تارے ولی کیتے سے راہیں ہُو (3)
کلمے نال بجھائے دوزخ جتھے اگ بلے ازگاہیں ہُو
کلمے نال بہشتیں جانا جتھے نعمت سنج صباحیں ہُو
کلمے جیہی کوئی نہ نعمت باہو اندر دوہیں سرائیں ہُو

1- گنج شریف ص508
2- ایضاً ص506
3- ابیات باہو ص492

نوشہ صاحبؒ نے جس قدر کثرت سے اور اچھوتے انداز میں کلمہ کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے پنجابی شاعری میں اسکی مثال بہت کم ملتی ہے۔ نوشہ صاحبؒ کے کلام میں سے مزید چند مثالیں پیش ہیں:

کلمہ پڑھیا رسولؐ دا دوزخ ہویا حرام[1]
بہشت اسانوں بخشیا نوشہ رب انعام
کلمہ پونجی فقر دی ہور کلمے دی آس
نوشہ کلمہ آکھیاں رہیا نہ خوف ہراس

o

شیخ مشائخ اولیئے عالم فاضل پیر[2]
کلمہ پونجی سب دی نوشہ کہے فقیر
حافظ فاضل متقی پیر فقیر اولیاء
کلمہ پونجی سب دی ہور نہ پونجی کاء

o

کلمہ پونجی اصل ہے نفع فضل خدائے[3]
نوشہ کلمہ آکھیاں مومن بخشیا جائے
مونہوں کلمہ آکھنا نوشہ دلوں یقین
اصل فقیری ایہہ ہے ایہو سچا دین

کلمہ گو کی بخشش اور جنت کے حصول کی دلیل قرآن پاک سے پیش کرتے ہوئے نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

1- گنج شریف ص496
2- ایضاً ص497
3- ابیات باہو ص498

جیں ہک واری کلمہ پڑھیا سچے دلوں زبانوں [1]
تے قائم رہیا کلمہ اتے سنیو مسلمانوں
داخل وچ بہشت دے ہوسی بناں حساب کتابوں
رہسی نت بہشتے اندر چھٹسی سب عذابوں
بھاویں کیتی ہووس چوری یا کیتا ہوس زناہ
برکت کلمے پاک دی رب بخشیسی اسدے گناہ

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ وہ محمدیؐ مہر ہے جسکا ہر مومن کے نامہ اعمال پر لگنا ناگزیر ہے۔ اگر کسی شخص کے نامہ اعمال پر یہ پاک مہر نہ ہوگی تو حشر کے روز وہ شفاعت رسول ﷺ سے محروم رہے گا۔ کیونکہ بخشش کے لیے پہلی شرط مسلمان ہونا ہے اور مسلمان ہونے کیلئے کلمہ طیبہ کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق بے حد ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

کلمہ کہو محمدیو دلوں بجانوں من [2]
آکھے نوشہ قادری کلمہ گوواں دھن
نوشہ دوزخ نہ پوے کلمہ گو زبان
جیہناں کلمہ آکھیا بخشیا تنہاں رحمان
نوشہ جس کلمہ کہیا کامل ولی بھیا
کلمہ مُہر محمدیؐ ولیاں ایہہ کہیا
کلمہ مہر محمدیؐ صاحب دے دیوان
عمل نامے جس دے لگے نوشہ سو پردان

1- گنج شریف ص500
2- ایضاً ص501

کلمہ مہر محمدیؐ جس لگے سو معاف
نوشہ کلمہ جو پڑھے او ہو مرد اشراف

نوشہ صاحبؒ نے کلمہ طیبہ کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس کے معنوی پہلوؤں کا جس گیرائی اور گہرائی سے ذکر کیا ہے، وہ نوشہ صاحبؒ کا ہی حصہ ہے۔ اس ضمن میں دوسرا کوئی صوفی شاعر ان کے ہم پلہ دکھائی نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں ایک اور اہم نکتہ جس سے نوشہ صاحبؒ کا فکری انگ مزید نکھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک کلمہ کی ظاہری اور باطنی خوبیاں کسی سالک پر اس وقت تک منکشف نہیں ہوتیں جب تک وہ کسی کامل مرشد سے کلمہ نہیں سیکھتا۔ ایک کامل مرشد ہی کلمے کے جملہ اسرار و رموز بیان کر سکتا ہے۔ مرشد سب سے پہلے اپنے مرید کو کلمے کے ورد کی تعلیم دیتا ہے۔ پھر مرشد کی خاص توجہ سے کلمے میں پوشیدہ اسرار و رموز مرید کے قلب پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے ابیات میں اپنے مرشد کو دعائیں دی ہیں کہ انہوں نے کلمہ کے ذریعہ نفی و اثبات کے تمام رازوں سے شناسا کر دیا ہے۔ لہٰذا فرماتے ہیں:

ا: اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی ہو[1]
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہوؒ جیں ایہہ بوٹی لائی ہو

جبکہ حضرت نوشہ صاحبؒ تو اپنے مرشد پر اپنی جان قربان کرنے کے طالب نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے ان کو کلمے کے تمام اسرار و رموز سے آشنا کیا تھا۔ وہ کلمہ اور کلمہ پڑھانے والے سائیں (مرشد) کی توقیر یوں بیان کرتے ہیں:

1- ابیات باہوؒ ص 63

کلمہ پڑھیاں سے پھل پایئے دُدھ پُت دھن پایا[1]
تخت بخت طالع وڈیائی ایہہ سب کلمیوں پایا
دین ایمان شراب طہورا تے بہشت کلمہ وڈیایا
نوشہ اس سائیں تھوں صدقے جس کلمہ پاک پڑھایا

نوشہ صاحبؒ نے اپنے کلام میں کلمے کا ذکر کرتے ہوئے بعض مقامات پر نہایت ہی دلکش اور جاذب انداز اپنایا ہے کہ پڑھنے والا ان کی فنکارانہ صلاحیت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا:

مومن سونا مکہ سکہ پاک محمدؐ والا [2]
دین اسلام ٹنکسال بادشاہی کردا اعلیوں اعلیٰ

نوشہ صاحبؒ اپنے مرید حضرت پیر محمد سچیار کو مخاطب کر کے حاصلِ کلام یوں بیان کرتے ہیں:

اللہ من تے من محمدؐ تے مرشد من سچیارا[3]
دلوں زبانوں کلمہ پڑھ لئے تاں ہووے چھٹکارا
کلمہ دین دنی دا نوشہ اس بن نہیں گزارا
بن کلمہ نہ ہووے نوشہ کسے دا پار اتارا

O

1- گنج شریف ص506
2- ایضاً ص503
3- ایضاً ص505